حج کیا ہے؟

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ناشر

یونائیٹڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن، استھاواں، نالندہ

باھتمام

مجلس ثقافت ونشریاتِ اسلام، جامعہ ربانیہ، مظفرپور، بہار

بارِ اوّل

۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء

نام کتاب	: حج کیا ہے؟
نام مصنف	: مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
صفحات	: ۴۰
تعدادِ اشاعت	: ۱۰۰۰
قیمت	: ۴۰
ناشر	: یونائیٹڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن، استھاواں، نالندہ
باہتمام	: مجلس ثقافت ونشریاتِ اسلام، جامعہ ربانیہ، مظفرپور، بہار

ملنے کے پتے

(۱) جامعہ اسلامیہ بھٹکل، کاروار، کرناٹک
(۲) مدرسہ قاسمیہ بنی آباد، مظفرپور، بہار
(۳) مدرسہ رحمانیہ منکی، ہوناور، کاروار، کرناٹک
(۴) معہد امام حسن البنا شہید، بھٹکل، کاروار، کرناٹک
(۵) مکتبۃ الشباب العلمیۃ، شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنو
(۶) مکتبۃ الدارین، ندوہ روڈ لکھنؤ

باہتمام

مجلس ثقافت ونشریاتِ اسلام

جامعہ ربانیہ اشفاقیہ، انکھولی بیلپکونہ، مظفرپور، بہار

عرض ناشر

الحمد للّٰہ ربّ العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين أما بعد:

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مدیر الفرقان مولانا منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی درخواست پر الفرقان کے ۱۳۷۰ھ کے حج کے نمبر کے لئے یہ مضمون تحریر فرمایا تھا، مولانا نعمانی نے دراصل حضرت مصنف سے ان کے سفرحج کی داستان رقم کرنے کی گذارش کی تھی، لیکن مولانا نے ازراہ تواضع اپنے سفرحج کی تفصیل سنانے کے بجائے، فلسفۂ حج پر پرمغز وقیع اورگراں قدر مقالہ سپرد قلم فرما کر ماہنامہ ''الفرقان'' کو زینت بخشی، اگرچہ اس کے بعد بھی کئی سال مولانا نعمانی نے حج کے موقعہ پر خصوصی شمارہ شائع کیا، اوران کے اصرار پر حضرت گیلانیؒ کو آخر اپنے سفرحج کی روداد قلمبند کرنی ہی پڑی جو اس شمارہ کے بعد بالترتیب ۱۳۷۱ھ اور ۱۳۷۲ھ کے ماہ ذی الحجہ کے خصوصی شمارہ میں شائع ہوئی۔

ان چاروں قسطوں کی نقل (عکسی کاپی) حضرت مصنف کے برادر زادۂ گرامی قدر سید جمال احسن گیلانی (بارک اللہ فی حیاتہ) مقیم سبزی باغ پٹنہ کے پاس تھی اور وہ اس کی اشاعت کی فکر میں تھے، چنانچہ ایک ملاقات کے موقعہ پر راقم کو پورا مجموعہ عنایت فرمایا کہ کہیں اس کی اشاعت کا نظم کیا جائے۔

مدینہ کا سفرنامہ ''دربار نبوت کی حاضری'' حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ علیہ الرحمۃ کے مقدمہ کے ساتھ حضرت مدیر الفرقان نے کتابچہ کی شکل میں شائع کردیا تھا جو ہنوز اہل علم کے درمیان متعارف ومقبول ہے، غالبًا پاکستان میں بھی اس کی اشاعت ہوئی، سید جمال گیلانی صاحب کی عکسی کاپی دو سال قبل راقم کی کوشش سے استاذ محترم مولانا فیصل احمد ندوی دامت برکاتہم نے ''سفر حرمین'' کے نام سے ہے ادارہ احیائے علم ودعوت لکھنؤ کی طرف سے مکتبۃ الشباب العلمیہ کے اشتراک سے شائع کی تھی اس مضمون کو بھی اسی سفرنامہ کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کرنے کا ارادہ تھا اور اس کے لئے تیار بھی کرلیا تھا کہ پھر مولانا نے موصوف کو خیال آیا کہ اس کی افادیت کے پیش نظر اسے الگ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جائے، سفرنامہ کے ساتھ اس کی حیثیت ضمنی ہوجائے گی اور اس اہم مضمون سے کماحقہ استفادہ نہیں ہوسکے گا۔

حج کے فلسفہ اور اس کی حکمت ومصلحت کی توضیح وتشریح پر مشتمل یہ مضمون سطر سطر سے مصنف علام کی دقت نظری، باریک بینی اور دیدہ وری کی زندہ شہادت ہے، کعبہ کی مرکزیت پر ایسی عالمانہ بحث شاید ہی اس سے پہلے کی گئی ہو، خدا کرے اس کے اہم مشمولات عربی قارئین کے سامنے بھی آسکیں راقم نے کتاب کی تصحیح کے دوران یہ مضمون بالاستیعاب ہندوستان کے جلیل القدر عالم حضرت الاستاذ مجددی مولانا برہان الدین سنبھلی دامت برکاتہم، شیخ التفسیر وصدر شعبۂ افتاء دارالعلوم ندوۃ العلماء کو سنایا تو حضرت موصوف نے فرمایا کہ اردو میں ہونے کے باوجود یہ مضمون تشریح وتوضیح کا محتاج ہے، نیز فرمایا کہ یہ مصنف کے وفور ذہانت کے ساتھ ان وسعت مطالعہ کی منہ بولتی شہادت ہے۔

میں برادرم عزیز حماد کریمی ندویؔ کا شکر گذار ہوں کہ ان ادارہ مجلس ثقافت ونشریات مظفر پور کے اشتراک کے ساتھ حضرت مصنف کے مولد استھانواں (بہار شریف) کی نوعمر تنظیم یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن کی طرف سے اس کی اشاعت منظر عام پر آرہی ہے، ربّ کریم قبولیت سے نوازے۔

والسلام

طلحہ نعمت

حج کیا ہے؟

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہاتھی کا کوہ پیکر جثہ ہو یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم وحبّہ، ہر ایک میں دیکھا جارہا ہے کہ ان کے بکھرے ہوئے اجزاء کی پیوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کے لئے بھی اور اپنے اپنے نوعی کمالات کو نشو ونما، ارتقاء وبالیدگی کے اخری نقاط تک پہونچانے کے لئے بھی ایک ایسا مرکزی نقطہ ہر ایک میں پایا جاتا ہے کہ اس مرکزی نقطے کے وجود کو اس سے اگر نکال لیا جائے تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزاء بکھر جائیں گے اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کر کے ارتقاء ونشو ونما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا، یہ عمل بھی رک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کو مثال سے سمجھیے، آم کی گٹھلی یا اسی قسم کے پھلوں کے تخم کو آپ نے دیکھا ہوگا، آپ جانتے ہیں کہ آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے، پتے، شاخیں، پھول، پھل کا ایک طوفان ہوتا ہے جو اسی گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جز بنتا رہتا ہے۔ لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیریئے، اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی جسے تخموں اور گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد خواہ کتنی ہی اچھی نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بویا جائے اور چشموں کے کیسے ہی صاف وشفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے، لیکن بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے آپ دیکھیں گے کہ گٹھلی سڑتی چلی جارہی ہے، تا اینکہ بالآخر سڑسڑ کر اس کے اجزاء مٹی میں مل کر ادھر ادھر غائب ہوجائیں گے۔

حاصل یہی ہے کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو لیکن کسی درخت کے شجری نظام اور اس کے سارے آثار ونتائج کا حصول یقیناً اسی مرکزی نقطے کے ساتھ وابستہ ہے، اس کو نوچ کر گٹھلی سے اگر الگ کرلیا جائے تو سارے فیوض جن سے درخت کا تنہ، اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتے،

پھول، پھل جو مستفید ہوتے رہتے ہیں، ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیوانی و انسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطہ کی ہے جسے عوام گٹھلیوں کا انکھوا کہتے ہیں، دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ جس کا نام زمین اور دھرتی ہے، جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی، انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں، ان ساری پیداواروں کے لئے زمین بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز رکھتی ہے جسے ارضی فیوض و برکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے؟ جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشو و نما اور ارتقا و بقاء کا خون دوڑ رہا ہے، یا یوں پوچھیے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسا انکھوا رکھتی ہے کہ اس کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو جو زمین سے پیدا ہو رہی ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کرے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جسد ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں، نہ ماننے والوں سے بحث نہیں، لیکن جنھوں نے مانا ہے کہ:

"جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِلنَّاسِ" (المائدہ)

(بنایا اللہ نے الکعبہ کو جو البیت الحرام (محترم گھر) ہے، سارے انسانوں کے قیام کا ذریعہ۔)

یہ اسی کی خبر ہے جو زمین کا اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے، اب خود بتائیے کہ اس صورت میں ان سوالوں کے جواب میں ایک مومن بالقرآن کی نظر ''کعبہ'' کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے، وہی ''الکعبہ البیت الحرام''، جس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی قرآن میں قیام و بقا سے بھی آگے بڑھ کر "وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْناً" (البقرۃ) (اور دیکھو جب بنایا ہم نے اسی ''البیت'' [گھر] و انسانوں کیلئے مثابہ اور امن کا [ذریعہ]، کی بھی جب تصریح کر دی گئی ہو، مَثَابَة کی لغوی و اصطلاحی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی اپنے مفردات میں لکھتے ہیں: ''**سمی مکان المستقی علی فم البئر مثابةً**'' (پینے والوں کے لئے کنویں کے منہ پر جو جگہ ہوتی ہے اسی کو مثابہ کہتے ہیں۔)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ پینے والوں کو کنویں کا پانی جس جگہ سے پلایا جاتا ہے، اسی کو عربی میں ''مثابہ'' کہتے ہیں، اب سوچیے کہ یہی حیثیت ''مثابہ'' ہونے کی جب ''الکعبہ'' کو حاصل ہے تو حاصل اس کا بجز اس کے اور کیا ہوا کہ سارے فیوض و برکات جو زمین کے اس کُرّے پر تقسیم ہو رہے ہیں ان کے گذرنے کا مرکزی نقطہ یہی ''الکعبہ'' ہے، اور صرف ''مثابہ'' ہی نہیں بلکہ اسی آیت کے لفظ ''امنا'' سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امن و امان کی بھی ساری ذمہ داری قدرت نے اسی ''البیت الحرام'' کے ساتھ وابستہ فرما دی ہے، الغرض (۱) یہاں جس کسی کو جہاں کہیں جو کچھ بھی مل رہا ہے اسی ''الکعبہ'' کی راہ سے مل رہا ہے، یہ قرآن کے نصوص صریحہ کا اقتضا ہے، گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ ساری کائنات کے ساتھ ''العرش'' کی نسبت قرآن نے جو بیان کی ہے، الرحمٰن اسی ''العرش'' کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرما رہا ہے، یہی نسبت زمین کے خاص کُرّے کے ساتھ الکعبہ بھی رکھتا ہے، روایتوں میں ''الکعبہ'' کے متعلق اس قسم کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں، مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب کر کے رب العزت نے فرمایا کہ:

یا آدم اهبطت لك بيتاً تطوف به كما يطاف حول العرش، وتصلی عنده كما يصلی عند عرشی۔

(اے آدم! اتارا ہے میں نے تیرے لئے ایک گھر، تو اس گھر کا اسی طرح طواف کریگا، جیسے ''العرش'' کے گرد طواف کیا جاتا ہے، اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز پڑھے گا جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے۔)

(۱) مجھے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ قرآن کے بعض الفاظ مثلاً ''النـــاس'' ہی کے معنے جو لغت میں ہیں اس کو چھوڑ کر من مانے معنی لکھ دیتے ہیں مثلاً ''النـــاس'' سے مراد اہل مکہ لیتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ لغوی معنی کو چھوڑنے کی وجہ کیا ہوئی، جب کہ کافةً للناس، یا رب الناس ، ملک الناس ، وغیرہ میں یہی لوگ ''الناس'' کے وہی معنی بیان کرتے ہیں جس کے سوا لغۃً اس لفظ کا دوسرا ترجمہ صحیح نہیں ہوسکتا، جہاں تک میرا خیال ہے غیر شعوری طور پر کچھ اس قسم کا احساس ان لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ قرآن جس ماحول میں نازل ہوا ہے اس کے لحاظ سے زیادہ وسیع معانی پر قرآنی الفاظ کا اطلاق کچھ ان کے لئے ناقابل برداشت سی بات ہوتی ہے، کاش! وہ سمجھتے کہ اس قسم کا احساس ان کے ایمانی دعوے کی تکذیب تو نہیں ہے، بے شک جس ماحول میں قرآن نازل ہوا وہ جاہلی ماحول تھا لیکن جو نازل کر رہا تھا کیا اس کا علم محیط جاہلی ماحول کا تابع تھا؟

(۲) (تاریخ الخمیس عن قتادہ وعطاء، ص: ۸۹، ج ۱)

اور ایک یہی روایت نہیں بلکہ اسی قسم کے الفاظ دوسری روایتوں میں جو پائے جاتے ہیں ان سے بھی اسی مسئلے کی تصدیق ہوتی ہے کہ کُرّہٴ ارض کا ''قلب'' اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات وفیوض اس زمین پر بٹ رہے ہیں وہ یہی ''الکعبۃ'' ہے، اور روایتوں کو تو جانے دیجئے، میں پوچھتا ہوں کہ مشہور قرآنی آیت "إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدىً لِلْعَالَمِينَ" (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ قطعاً وہی ہے جو ''مکہ'' میں ہے جو سارے جہانوں کے لئے مبارک بھی ہے، اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ بھی۔) کے بعد تو اس قسم کی روایتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی، آخر روایتوں سے اور کیا معلوم ہوتا ہے، یہی تو کہ زمین کے کرے پر سب سے پہلا نقطہ جو متعین کیا گیا یہ وہی حصہ ہے جسے ''الکعبۃ'' کی دیواریں اس وقت تک گھیرے ہوئے ہیں، روایتوں پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس واقعے کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا؟ لیکن قرآن کی خبروں کو جو یقین کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں ان کے لئے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے جو اس وقت بھی موجود تھا، جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے اور اس وقت بھی وہ غائب نہ تھا جب ''الناس'' یعنی نسل انسانی کے لئے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جارہا تھا، بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی جب وہ جس نے حد بندی کے اس عمل سے زمین کے اس خاص حصے کو امتیاز بخشا ہے تو اس سے بڑھ کر یقینی خبر اور کس کی ہوسکتی ہے۔

یہی نہیں بلکہ آگے "مبارکاً" کے لفظ کا اضافہ جو اس آیت میں کیا گیا ہے اس کا مطلب آپ خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ برکتوں کا خزینہ اور فیوض کا حقیقی دفینہ بھی زمین کے اسی حصہ کو بنایا گیا، یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے جس سے برکتیں ابل رہی ہیں اور وہیں سے چھلک چھلک کر ساری دنیا میں تقسیم ہو رہی ہیں، اور یہ میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ "العالمین" یعنی سارے جہانوں کے لئے راہ نمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا اور نبوت کو ختم کرکے ''العالمین'' کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا

جیسا کہ "ھدی للعالمین" کے الفاظ کا اقتضاء ہے تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ مادی برکتوں کا سرچشمہ جو مقام تھا اسی کو دینی واخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی مقرر کیا گیا، آخر "للعالمین" کے لفظ کا تعلق صرف ''ہدی'' ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ''مبارکاً'' کے لفظ کو بھی "للعالمین" سے مربوط سمجھنا چاہئے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اور واضح بینات کی روشنی میں بھی "أم القری" (جو مکہ کا قرآنی نام ہے) اس کے سمجھنے یا سمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے رہے۔ "القری" کا لفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو بسیط زمین کے کسی گوشے میں شرقاً وغرباً شمالاً وجنوباً پہلے پائی گئی ہوں، یا اب پائی جاتی ہوں، یا آئندہ پائی جانے والی ہوں، وہ ایشیا میں ہوں یا افریقہ میں، امریکہ میں ہوں یا یورپ میں، قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغب نے بھی ''ام القری'' کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان الفاظ کو نقل کیا ہے کہ

ان الدنیا دحیت من تحتها

(ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی)۔

اشارہ اس برکاتی مرکزیت کی طرف ہے جسے قرآن میں ''مبارکاً'' کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

بلکہ بجائے ''مکہ'' کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی ''بکۃ'' کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے میرے خیال میں یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے، نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے ''الکعبۃ'' کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے پیغمبر داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور میں ان والہانہ تمہیدی فقرات کے بعد کہ

''اے لشکروں کے خداوند تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں، میری روح خداوند کی بارگاہ کے لئے آرزومند بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا من، میرا تن زندہ خدا کے لئے للکارتا ہے''۔

پھر اس کی مثال دیتے ہوئے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے، فرماتے ہیں:۔

''گوریے نے بھی اپنا گھونسلا، اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے جہاں وہ اپنے بچے رکھیں''۔

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ:

''مبارک وہ انسان ہیں جن میں قوت تجھ سے ہے، اور ان کے دل میں تیری راہیں ہیں، وے بکہ کی وادی میں گذر کرتے ہیں، اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں۔ ''پہلی برسات اسے برسوں سے ڈھانپ لیتی ہے''۔

یہ داؤد کی کتاب ''زبور'' کے مزبور ۸۱ کے فقرے ہیں جس میں چاہ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا بلکہ قرآنی لفظ ''مبارک'' کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا کردیا گیا ہے، پہلی برسات الرحمن کی پہلی توجہ ہے جو کرۂ زمین کی آبادی کے لئے کی گئی۔

میں جانتا ہوں کہ آج کل کل زبور کے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں ان میں ''بکہ'' کے لفظ کو اپنی اصل صورت پر چاہا گیا ہے کہ باقی نہ رکھا جائے، بعض نسخوں میں بجائے ''وادی بکہ'' کے ''وادیٔ بقا(۱)'' اور بعضوں میں ''وادی بکاء'' کے الفاظ پائے جاتے ہیں، لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں، مسلمانوں میں آج کل سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلے میں جو کتاب سب سے زیادہ مقبول اور عموماً ہر جگہ مل سکتی ہے، اس میں آپ مشہور عیسائی عالم جو نسلاً یہودی تھا، یعنی پروفیسر مارگولیوتھ کی یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ بجز مکہ معظّمہ کے زبور کا یہ ''بکہ'' اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا، اور یہی میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام ''مکہ'' کے یہ بتاتے ہوئے کہ یہی سب سے پہلا گھر ہے، مندرجۂ بالا آیت میں ''بکہ'' کے نام اور تلفظ کو جو اختیار کیا گیا ہے تو یہ اشارہ غالباً اسی مزبور ۸۱ر کی طرف ہے جس میں داؤد علیہ السلام نے ''بکہ'' ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے جو

(۱) افسوس ہے کہ زبور کا وہ نسخہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے جس میں بجائے ''وادی بکا'' کے ''وادی بکہ'' کا لفظ چھپا ہوا تھا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۲۳ء کا یہ مطبوعہ نسخہ تھا، دیوبند سے آتے ہوئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر فقیر نے کسی عیسائی کتب فروش سے زبور کا یہ نسخہ لیا تھا، یہ الگ چھپا ہوا تھا، لوح اس کی سبز رنگ کی تھی۔

''الکعبہ'' کی قدامت کے لئے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے، موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے، لیکن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے، ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، اس میں ''الکعبہ'' کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی، تورات کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہ

''اس نے بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا، یم (یعنی سمندر) اس کے پچھّم اورعی اس کے پورب تھا۔'' (تکوین باب۱۲)

توارت کے جو عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بیت ایل یعنی بیت اللہ جس کے پورب طرف ابراہیم نے اپنا ڈیرا گاڑا تھا۔ یہ وہی ''الکعبہ'' (بیت اللہ الحرام'' کا مرکزی نقطہ) تھا جہاں بعد کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ گھر اٹھایا تھا، یم یعنی سمندر کا الکعبہ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے، رہا ''عی''، قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لئے کرنا چاہئے، کم از کم مقدمہ تفسیر غایۃ البرہان ہی کو پڑھ لیا جائے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی کتاب استثنا یا ثنی کا مشہور فقرہ:

''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار(۱) قدسیوں کے ساتھ آیا۔'' (باب۳۳، درس۲)

بائبل کی جغرافیائی تحقیق بھی اسی نتیجے تک پہونچاتی ہے کہ فاران یا پاران سے اسی خطے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں ''الکعبہ'' واقع ہے، اور بخاری کی روایت بھی بتاتی ہے کہ کعبہ والے شہر مکہ میں دس ہزار صحابیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ داخل ہوئے تھے، فاران کی پوری تحقیق خطبات احمدیہ مولفہ سرسید مرحوم میں پڑھی جاسکتی ہے۔

(۱) دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ ابھی تازہ اڈیشن بائبل کا بزبان اردو جو شائع ہوا ہے اس میں ''دس ہزار'' کی جگہ ''ہزار ہا ہزار'' کے لفاظ درج کردیے گئے ہیں۔

بہرحال اگرچہ بگاڑنے اور چھیلنے، مشتبہ کرنے کی مسلسل کوششوں کی آماجگاہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے صدیوں سے بنے ہوئے ہیں، لیکن بچی کھچی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن میں کرہ زمین کے اس مرکزی ''مقام مبارک'' کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر سب کو جمع کیا جائے تو وہ کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے ایسا رسالہ جسے دیکھ کر اضطراراً اس قرآنی دعویٰ یعنی: "یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآئَهُمۡ" (۱) (اہل کتاب) جانتے ہیں اس ''الکعبہ'' کو اسی طرح جیسے پہنچانتے ہیں وے اپنے بچوں کو۔) کی تصدیق واعتراف پر آدمی مجبور ہوجاتا ہے، کاش! کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لئے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کردیتا۔

سردست مذکورۂ بالا چند شہادتوں پر قناعت کرتے ہوئے میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ''الکعبہ'' کے متعلق اسلامی کتابوں میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے، لیکن عہد اسلام سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی کیا اس شبہ کی گنجایش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کردیا ہے اور یہ کتابیں تو خیر مذہب ودین سے تعلق رکھتی ہیں، مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان وروم کے مؤرخوں کی کتابوں میں سرزمین عرب کے اس پرانے معبد (الکعبہ) کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے، یونانیوں کے قدیم مؤرخ ہیروڈوٹس یا رومی مؤرخ سیس لس کی تاریخوں سے لوگوں نے جو فقرے نقل کئے ہیں، مولانا شبلی مرحوم کی سیرت میں بھی آپ کو وہ مل سکتے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی یا بے بنیاد ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ پشت زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں ان میں کوئی مکان یا گھر قرآن کے اس ''اول بیت'' کے مقابلے میں اس حیثیت سے اپنے آپ کو نہیں پیش کرسکتا کہ اس وقت تک مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو، بلکہ احترام وعزت کی مرکزیت کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

(۱) اہل کتاب پہنچانتے ہیں اس کو جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، یہ دعویٰ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی کیا ہے اور الکعبہ کے متعلق بھی۔

اس میں شک نہیں کہ شہریا دنیا کی بعض آبادیاں بہت پرانی ہیں، لیکن سوال کسی شہر اور آبادی کے متعلق نہیں، بلکہ ایک مختصر سے گھر جیسا کہ ''الکعبہ'' ہے، اس کے متعلق میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اتنا پرانا گھر کیا اس وقت زمین کے اس کُرّے پر مل سکتا ہے، ہیروڈوٹس جو حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال پہلے گذرا ہے اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عرب کے اس معبد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں، سوچئے تو اس کا مطلب کیا ہوا؟ ولادت مسیح علیہ السلام کی طرف جو سنہ منسوب ہے قریب ہے کہ دو ہزار سال تک وہ پہونچ جائے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہیروڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً ڈھائی ہزار سال کی ہے، خیال کرنا چاہئے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دیجاتی ہو کہ بہت قدیم زمانے سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، تو اس کی قدامت کی تاریخ کتنی طویل ہوجاتی ہے، خصوصاً اسی کے ساتھ جب اس کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخی معلومات قرار دیا جاسکتا ہے، ان کی رت ڈھائی تین ہزار سال سے آگے نہیں بڑھتی، کارتھیج ہو یا ایتھنز، (۱) ہامسی ہو یا رومہ سب ہی کا حال یہی ہے، بلکہ مشرق کے موجودہ شہروں یا قصبوں میں بعض کے متعلق قدامت کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے اگر خرافاتی روایات اور اساطیری قصص وحکایات سے قطع نظر کرلیا جائے تو ان کی تاریخ بھی دو ڈھائی ہزار سال سے آگے متجاوز نہیں ہوتی۔

اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی ''الکعبہ'' کا ذکر کرتے ہوئے منجملہ دوسرے صفات کے بعض مقامات میں اس کو ''البیت العتیق'' (پرانے گھر) کے نام سے جو موسوم کیا ہے یہ صفت ''الکعبہ'' کی صرف اضافی ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں تو ان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی ''حقیقی صفت'' یہی

(۱) آج کل یہ کھنڈر ہے اس راکھ کے نیچے دبا ہوا تھا جو اٹنا کے آتش فشانی دہانے سے نکلی تھی، حال میں راکھ ہٹائی گئی پورا شہر نکل آیا، بڑے دردناک مناظر اس کھنڈر میں سیاحوں کی نظر سے گذرتے ہیں، میرے ایک دوست کہتے تھے کہ چوراہوں پر راہ گیروں کی ہدایت کے لئے دیواروں پر بجائے ہاتھ کے انسانی شرمگاہ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، عیاشی کی یہ آخری حد ہے۔ **فاکثروا فیها الفساد فصب علیهم ربک سوط عذاب.**

ہے، یعنی ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں میں جو کبھی پائے گئے یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں، سب کے مقابلے میں یہی مکان کرہ زمین کا قدیم ترین پرانا گھر ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا ''بیت ایل'' اور قرآن کا ''بیت اللہ'' جس آبادی میں پایا جاتا ہے اس کو، اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے اس کو، الغرض ان سب کے متعلق تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرافیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے جسے سورۃ البقرہ میں ہم پاتے ہیں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ''امت اسلامیہ محمدیہ'' کو خطاب کرتے ہوئے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ: "وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا" (اور اسی طرح بنایا ہم نے تو لوگوں کو وسط اور بیچ والی امت۔) ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے ''الکعبۃ'' ہی کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے۔ کہ: "سَيَقُوۡلُ السُّفَهَاۤءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِهِمُ الَّتِیۡ كَانُوۡا عَلَيۡهَا قُلۡ لِّلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ" (قریب ہے کہ فرمایا یہ لوگ کہیں کہ کس چیز نے مسلمانوں کو اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے، کہہ دو کہ مشرق بھی اللہ ہی کے لئے ہے اور مغرب بھی اسی کا ہے، راہ نمائی فرماتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔)

بس حاصل یہی ہوا کہ بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے مسلمانوں کو زمین کے اس حصہ میں قبلہ جو عطا کیا گیا ہے جسے پانے والے خط مستقیم اور اس راہ پر پار ہے ہیں جو نہ مشرق سے زیادہ دور ہے اور نہ مغرب سے تو یہ خدا کی فضل اور اس کی حکمت کا اقتضا ہے۔

بہر حال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے بلکہ اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی امت قرار دیتے ہوئے ان کے اس حال کو اس قبلے سے جب تشبیہ دی گئی ہے جو ان ہی مسلمانوں کا آخری قبلہ ٹھہرایا گیا، تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے قرآن مطلع کرتا

ہے کہ ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے جو دنیا کے معمور آباد علاقوں کے درمیانی حصہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے معنی یہی ہوئے کہ روایتوں میں ''الکعبۃ'' یا ''مکہ'' کو سرّۃ الأرض (نافِ زمین) کے لفظ سے جو موسوم کیا گیا ہے دراصل اسی قرآنی خبر کی یہ تعبیر اور توضیح ہے، اور آج ہم جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق ومغرب کے سارے مواصلاتی ذرائع خواہ ان کا تعلق خشکی سے ہو یا تری سے یا فضا اور ہوا سے، تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اسی علاقے سے گذرنا پڑتا ہے جس میں ''الکعبۃ'' واقع ہے، اسی طرح شمالی اور جنوبی حصہ کے آباد علاقے جو کرہ زمین پر واقع ہیں جب ان کا حساب کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ شمال میں اسی درجہ تک اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں چالیس درجے تک عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر گویا سمجھنا چاہیے، ایک سو بیس درجے تک دنیا کی آبادی شمالاً وجنوباً پھیلی ہوئی ہے، اب حساب کیجئے اسّی سے بیس کو گھٹائیے تو وہ بھی ساٹھ ہوگا، اور چالیس میں بیس کا اضافہ کیجیے تو اس کی جمع بھی ساٹھ ہی ہوگی، پس معلوم ہوا کہ معمورہ کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں، اب اطلس اٹھا کر کر دیکھ لیجئے، وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں ''الکعبۃ'' واقع ہے اس کا محل وقوع اس میں کہاں ہے۔

اسی کے ساتھ کیا کم اچنبھے کی بات ہے کہ رنگ اور قد وقامت شکل وصورت کی خصوصیتوں کے لحاظ سے نبی آدم چار قسموں میں جو بٹتے نظر آرہے ہیں، مثلاً یورپ کے بے رنگ اور پھیکی جلد والے لوگ، اور ان ہی کے ساتھ کالے حبشی اور افریقہ کے عام باشندے، ان دونوں قسموں کو اگر ہم ان حصوں میں پاتے ہیں جو ''الکعبۃ'' سے بجانب مغرب واقع ہیں تو ٹھیک اسی کے بالمقابل چین کے زرد، اور ہندوسندھ کے گندم گوں سانولے لوگ ان علاقوں میں آباد ہیں جو ''الکعبۃ'' کے مشرق میں واقع ہیں، گویا اس طریقہ سے بھی ''الکعبۃ'' اپنے آگے پیچھے دو دو قسموں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے اس " اول البیت'' کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں یہ

بتایا ہے کہ "العالمین" کی ہدایت وارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا، یعنی "هدی للعالمین" کا مرکز ساڑھے تیرہ سو سال سے یہ جگہ جو بنی ہوئی ہے اور اس سے پہلے اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں یہ ابراہیمؑ کا مقام بنا، اسی کے ساتھ "فیه آیات بینات" (یعنی اس گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں) ان آیات بینات اور کھلی کھلی نشانیوں کو آپ تلاش کرتے چلے جایئے۔ راز کے بعد راز کا مسلسل انکشاف آپ پر ہوتا چلا جائے گا، تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے، جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کر سکتے ہیں، اقوام وامم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس "البیت العتیق" کے متعلق اُتے پتے ملتے چلے جائیں گے، اور یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قدرت کے مقررہ طبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسلِ انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی "الکعبہ" ہی تھا پھر مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوجانے کی صورت جب نکل آئی تو پھر مختلف مقامی قبلوں (۱) سے ہٹا کر سب کو اسی پرانے واحد مرکزی قبلے پر جمع کر دیا گیا، تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ان ہی "آیات بینات" سے ہورہی ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی روایتیں مثلاً اسرائیلیات کے مشہور اسلامی عالم وہب بن منبہ کے حوالے سے کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ مکہ کی ایک وادی میں جس کا نام ابطح ہے حضرت آدمؑ سے

(۱) تاریخ کا ایک ایسا ایک دور بھی نسل انسانی پر گذرا ہے جب قوموں کے قبلے مقامی بھی تھے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف خود قرآن میں بھی اشارے ملتے ہیں، مثلاً "ما أنت بتابع قبلتهم وما بعضهم بتابع قبلة بعض" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، نیز سیرت کی کتابوں میں یہ روایت جو نقل کی جاتی ہے کہ قبلوں کی تعداد پندرہ تھی، سات نچلے حصہ میں اور سات بالائی حصہ میں (دیکھو الخمیس) ہوسکتا ہے کہ کرہ زمین کے دونوں حصوں فوقانی وتحتانی جس میں امریکہ وغیرہ بھی واقع ہے ان ہی کے ہفت اقلیم میں سے ہر ہر اقلیم کے لئے ایک قبلہ ہو، اسی کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہو، چودہ قبلے تو مقامی ہوئے اور پندرہواں مرکزی قبلہ "الکعبہ" ہوا مگر یہ سارے قصے اس وقت کے تھے جب مختلف امصار وبلاد کے باشندوں کا ایک ہی کتاب، ایک ہی قبلہ پر جمع ہونا عملاً دشوار تھا پر جب اس کا امکان پیدا ہوگیا تو سارے مقامی قبلے، وقتی کتابوں کا قصہ ختم کرکے آدمؑ کی اولاد پھر ایک کر دی گئی جیسے بکھرنے سے پہلے سب ایک تھے۔

فرشتوں نے ملاقات کی اور خوش آمدید کہا، پھر بولے کہ اے آدمؑ اس گھر کا حج تم سے دو ہزار سال پہلے ہم لوگوں نے کیا تھا، بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بعد "قد جاء به الملك مكة فطاف بالبيت اسبوعاً ثم رجع إلى أرض الهند فمات بها" (۱)۔

(حضرت آدمؑ کو فرشتہ مکہ لایا، پھر سات دفعہ کعبہ کا طواف حضرت آدمؑ نے کیا، اور اس کے بعد ہندوستان واپس ہوگئے، جہاں ان کی وفات ہوئی۔)

یا اسی کے قریب قریب دوسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کی گئی ہے فرماتے تھے کہ: "حج آدم من الهند أربعين حجة" ہندوستان سے الکعبہ کا حج آدمؑ نے چالیس دفعہ فرمایا (۲)۔

میں مانتا ہوں کہ سنداً اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ بہت کچھ محل اشتباہ (۳) ہے، لیکن جب قرآن کے نص قطعی سے معلوم ہوتا ہے کہ الناس یعنی آدمیوں کے لئے سب سے پہلا گھر بکہ ہی میں بنایا گیا، تو ان روایتوں کا جو حاصل ہے یعنی حضرت آدمؑ وادی بکہ کے اس اول البیت سے تعلق رکھتے تھے، آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ رہا یہ مسئلہ کہ زمین کے اس خاص حصے کی تحدید وتعیین کے لئے ابتدا میں کیا صورت اختیار کی گئی تھی، یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی تحقیق میں سر کھپایا جائے، پتھر لگائے گئے تھے یا صرف مٹی کی دیواریں اٹھائی گئی تھیں، پھر پتھر اگر استعمال کئے گئے تھے تو کس قسم کے پتھر سے اس کی تعمیر ہوئی تھی، قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور یہی اس کا عمومی دستور ہے کہ غیر ضروری امور سے اعراض کرکے مسلمانوں کو بھی گویا سکھاتا ہے کہ ان

(۱) خمیس ص، ۹۰، ج، ۱

(۲) اس روایت کے آخر میں دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ ابن عباسؓ کے شاگرد تحیی نامی نے پوچھا کہ حضرت آدمؑ ہندوستان سے کیا کسی سواری پر آتے تھے، کہا جاتا ہے کہ ابن عباسؓ نے جواب میں کہا کہ بھلا آدمؑ کا بوجھ کون اٹھا سکتا تھا، البتہ ان کا ایک گام اتنی مسافت طے کر لیتا تھا جسے آج کل تین دن میں ہم پورا کرتے ہیں۔

(۳) اسی قسم کی روایتوں کی بناء پر مسلمانوں کے بعض علماء مثلاً مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کو ہندوستان ہی کو اپنا آبائی اور روایتی وطن اصلی قرار دینے پر اصرار رہا ہے۔

لایعنی مشاغل سے جہاں تک ممکن ہوا پنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

بہر حال یہ ہوسکتا ہے کہ قیمتی پتھر استعمال کئے گئے ہوں جن کا کوہستانوں میں میسر آنا چنداں دشوار نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ الکعبہ کے مثالی وجود کو ان قیمتی پتھروں کی شکل میں دیکھا گیا ہو جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے، بہر حال نہ یہ روایتیں ہی چنداں اہم ہیں نہ ان کے مفاد پر زیادہ زور دینا چاہئے۔ البتہ حجر اسود کے ساتھ جو خصوصی برتاؤ کیا جاتا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ''الکعبہ'' کی تعمیر میں اس پتھر کو کسی نہ کسی قسم کی اہمیت ضرور حاصل ہے(۱)، مگر اسی کے بالمقابل آپ دیکھ رہے ہیں کہ ''الکعبہ'' کی مرکزیت کے اظہار کے لئے ان تمام حقائق سے اس نے پردہ اٹھا دیا ہے جن کے متعلق ممکن ہے کہ غیر ایمانی عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو، اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ ''الناس'' کے قیام و بقاء کا تعلق بھی اسی ''الکعبہ'' سے ہے، وہی الناس کے لئے "مثابة" (پن گھٹ) ہے اور ان کا امن وامان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے، العالمین یعنی سارے جہانوں کے لئے وہ مبارک بھی ہے اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا، اسی بناء پر ایسی روایتوں کو مثلاً آیا ہے کہ: ''أنزل اللّٰه خيمة من خيام الجنة فوضعها بمثلة موضع البيت"(۲)۔ (اتارا اللہ نے جنت کے خیموں میں سے ایک خیمہ، پھر خدا نے اس کو رکھا اس جگہ پر جہاں ''البیت'' یعنی الکعبہ واقع ہے۔)

میں ان کو مذکورۂ بالا قرآنی حقائق کی تعبیر و تفسیر سمجھتا ہوں، مآل ان روایتوں کا بھی وہی ہے کہ انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا خالق کائنات نے جب فیصلہ فرمایا تو اس کے

---

(۱) ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ اس پتھر کو ہندوستان سے لے گئے تھے (دیکھو عینی شرح بخاری) بعض مغربی سیاح جو بھیس بدل کر مکہ گئے تھے یہ خبر لائے ہیں کہ ''حجر اسود'' شہابی نوعیت کا پتھر معلوم ہوتا ہے، گویا ان لوگوں نے اتنا تو مان لیا کہ یہ زمینی پتھر نہیں ہے، اور روشن ہونے کے بعد سیاہ ہو گیا ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ ان روایتوں کی گویا وہ تائید کر رہے ہیں جن میں آیا ہے یہ کہ زمین کا نہیں جنت کا پتھر تھا اور ابتداء میں اس کا رنگ سفید تھا پھر سیاہ ہو گیا۔

(۲)۔ (الخمیس ص ۹۱، ج:۱)

قیام و بقا نشو و نما، امن و ارتقا کے لئے "الـكعبه" کو مرکز قرار دیا گیا، اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لئے "العـرش العظيم" پر الرحمٰن مستوی ہوا، اسی طرح کرۂ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لئے ''الکعبہ'' کو اس نے اپنی تجلی کی فرودگاہِ خاص ٹھہرایا، اور بقول حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز، اگرچہ آفتاب آئینے میں نہیں اتر تا لیکن خاص قسم کی تجلی آفتاب کی آئینے میں جو ہوتی ہے اسی کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہو بہو کامل آفتاب آئینے میں جھلکتا اور چمکتا نظر آ رہا ہے، کچھ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ جو آسمان و زمین میں بھی نہیں سما سکتا، وہی خالقِ ارض و سماوات "الكعبه" کی ''تجلی گاہ خاص'' میں کچھ اس طرح نمایاں ہے کہ آئینے کو جیسے بیت الشّمس کہہ سکتے ہیں اسی طرح ''الکعبہ'' پر بھی ''بیت اللہ'' کا اطلاق ایک صحیح مشاہداتی یافت ہی کا یہ اعتراف ہوگا، ذاتِ حق کی یہی تجلی کامل درحقیقت بنیاد ہے ان سارے دینی اور روحانی تعلقات کی جن کو ''الکعبہ'' کے ساتھ اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ مختلف قطعاً دو مختلف نوعیت کے تعلقات اسی ایک تجلی گاہِ ربانی کے ساتھ اسلام نے قائم کیے ہیں یعنی ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ''الصلوٰۃ'' (نماز) کے لئے دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ پانچ دفعہ سارے جہان کے مسلمانوں کا رخ اسی ''الکعبہ'' کی طرف پھیرنے کو اسلام ضروری قرار دیتا ہے، مسلمانوں کو دن کے ان پانچ وقتوں میں اسلام جب "الكعبه" کے سامنے لا کر کھڑا کرتا ہے تو اس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ زور جسم کی صفائی اور لباس کی صفائی بلکہ ہر اس عضو کی صفائی اور پاکیزگی پر دیتا ہے جو عام حالات میں گرد و غبار، گندگی، میل کچیل سے محفوظ نہیں رہ سکتے، باضابطہ کامل وردی میں پھر حکم دیا جاتا ہے کہ کمالِ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ دربارِ الٰہی کی حاضری کی سعادت حاصل کریں، عرض و معروض میں بھی لجاجت و سماجت کے آخری حدود تک پہونچنے کی کوشش کریں، الغرض اپنی اپنی ایک ایک حرکت اور ایک ایک سکون سے اس احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کریں کہ اقتدار و اختیار کے آخری قاہرانہ قوتوں کے

سرچشمے کے آگے اپنے آپ کو وہ ذلت ومسکنت کی ممکنہ شکلوں کے ساتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ الغرض بجائے شور اور ہنگامے کے ہر قول اور عمل کو نظم وضبط کے انتہائی دباؤ کے نیچے رکھنا نماز کی جان اور حقیقی روح ہے۔

پس ''الکعبۃ'' کے سامنے آنے کی ایک شکل تو یہ ہے جس کا نظارہ ہر مسجد میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے، لیکن یہی ''الکعبۃ'' اور ''خدا کی بارگاہ'' ''تجلی گاہِ ربانی'' ہے۔ اسی کے آگے اسلام ہی ان ہی مسلمانوں کو لاتا ہے جنھیں وہ مسجد میں لے جاتا ہے پر کس شان کے ساتھ؟ تمدن وتہذیب کے ماحول کا سارا لباس اتروالیا جاتا ہے، سلی ہوئی معمولی دو پلی ٹوپی تک سر پر رکھنے کا اب وہ روادار نہیں ہے، جو سب کچھ پہنتے تھے اور اسلام ہی ان کو سب کچھ پہنا رہا تھا، اچانک آج وہی اصرار کررہا ہے کہ بجز ان دو کفنیوں یا لنگیوں کے جنھیں حاجی احرام کے نام سے گلے میں ڈالے رہتے ہیں، کسی دوسرے کپڑے کا اضافہ ان کے لئے اس حال میں درست نہ ہوگا، حد یہ ہے کہ ان کفنیوں کے پلوں کو جوڑنے کے لئے گرہ تک ڈالنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔(۱)

اب ذرا مسجد کے ان ہی نمازیوں کو دیکھئے جو قبا دربر، عمامہ برسر، وقار ومتانت کی انتہائی سنجیدگیوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں اسی ''الکعبۃ'' کے سامنے کھڑے ہوئے تھے، آج حج کے میدانوں میں ان ہی نمازیوں کا کیا حال ہے، سر کھلا ہوا ہے، بال بڑھے ہوئے ہیں، ناخنوں کی درازی حد سے گذری ہوئی ہے، گرد میں سارا جسم اٹا ہوا ہے، وہی اسلام جو دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ اگر غسل نہیں تو ہر نمازی کو نیم غسل (وضو) کا حکم دیا کرتا تھا، آج ان پر اصرار کررہا ہے کہ الجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کے لئے کنگھے کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بہ ضرورت نہانے پر مجبور بھی ہوں تو جس اسلام کو مسجدوں میں دیکھا جاتا تھا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک عضو سے میل کچیل کے ازالہ کو فرض

(۱) فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی کانٹے یا اسی قسم کی چیزوں سے ان کو جوڑ لیا جائے۔

ٹھہرا رہا تھا ''البراجم والمغابن'' (۱) تک کو ملواتا تھا، وہی فتویٰ دے رہا ہے کہ: ''ازالۃ التفث حال الاحرام حرام'' (احرام کی حالت میں میل کچیل اور بدن سے کثافتوں کا دور کرنا ناجائز ہے۔)

"قوموا للّٰہ قانتین" (کھڑے رہو (نماز میں) چپ چاپ) کے قرآنی مطالبے سے جس اسلام کی مسجدیں گونج رہی ہیں، جماعت تک میں شریک ہونے کے لئے تیز قدمی اور لپک کر جھپٹنے تک کو دربارِ الٰہی کی ادب شناسی سے محرومی قرار دیا گیا ہے، وہی اسلام اعلان کررہا ہے کہ حج کی راہ میں جتنا زیادہ چیخ سکتے ہو، چیختے چلے جاؤ، پیغمبر ﷺ کا بیان ہے کہ "أفضل الحج العج" (بہترین حج وہ ہے جس میں غل شور مچایا جائے) یعنی لبیک الخ کے کہنے میں جتنا زور لوگ لگا سکتے ہوں لگائیں۔

جمعہ کی نماز کے سلسلے میں خطبے کے وقت کنکریوں سے کھیلنے والوں تک کو لغویت کا مرتکب قرار دیا گیا ہے، لیکن حج کے میدان میں وہی اسلام حکم دیتا ہے کہ چلاتے اور چیختے ہوئے ایک وادی سے دوسری وادی کی طرف، ایک پہاڑ کے دامن سے دوسرے پہاڑ کے دامن تک دوڑتے ہوئے آؤ بھی اور دوڑتے ہوئے جاؤ بھی، انتہا یہ ہے کہ ان ہی حاجیوں سے ایسا فعل بھی کرایا جاتا ہے، جس پر رقص کا شبہ اگر کیا جائے تو یہ بے محل شبہ نہیں ہوسکتا۔ آخر طواف جو حج کا ایک رکن رکین ہے اس میں ایک ٹولی کے بعد دوسری ٹولی ''الکعبۃ'' کے چاروں طرف جو گھومتی رہتی ہے، اصطلاحاً رقص کا اطلاق اس پر صحیح نہ ہو لیکن جو نہیں جانتے ہیں وہ مسلمانوں کے اس طریقۂ عمل کو آپ خود سوچیے کہ کیا سمجھیں؟ بعضوں نے اس پر تعجب بھی کیا ہے، لیکن اسی تعجب میں تو سارا راز چھپا ہوا ہے، سچ تو یہ ہے کہ انسانی شائستگی کے معیار کو اسلام نے اتنا بلند کردیا ہے کہ طواف خواہ واقعہ کے لحاظ سے کچھ بھی ہو، لیکن رقص یا ناچ کے لفظ کے اطلاق پر اپنے تو اپنے شائد دل پر جبر کیے بغیر غیر بھی آمادہ نہیں ہوسکتے۔

(۱) انگلیوں کی پشت کی گرہوں کے سامنے سکڑی ہوئی کھال کے جو حصے ہیں ان ہی کو براجم کہتے ہیں، اور مغابن جسد انسانی کے ان حصوں کو کہتے ہیں جو عمیق اور پوشیدہ رہتے ہیں مثلاً بغل، بن ران وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسجدوں کے برعکس حج کے میدانوں میں جو کچھ کیا جاتا ہے، دوڑایا جاتا ہے، گھمایا جاتا ہے، کنکریاں چنوائی جاتی ہیں، اور اس حال میں رہنے کا حکم دیا جاتا ہے جس حال میں دیوانوں اور سرگشتوں کو دیکھا جاتا ہے، سر کھلے ہیں، ناخن بڑھے ہوئے ہیں، بال الجھے ہیں، بدن میل کچیل میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیا بات ہے کہ ایک ہی اسلام اچانک سنجیدگی ومتانت ووقار کے سارے قصوں کو ختم کر کے مسلمانوں پر اس حال کو کیوں طاری کراتا ہے۔ ان کے کانوں میں اس نے کیا پھونک دیا ہے کہ دیوانوں کی طرح کبھی ادھر جاتے ہیں ادھر جاتے ہیں، کبھی دوڑتے ہیں، کبھی روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، چلاتے ہیں، اس سے بھی بڑھ کر کبھی اس تودے پر کنکریاں پھینکتے ہیں، کبھی اس پتھر پر سنگریزے برساتے ہیں۔ چکر کاٹتے ہوئے ان ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ ناچ بھی رہے ہیں، گا بھی رہے ہیں، رہ رہ کر بوسہ کے لئے لبوں کو بھی کسی چیز پر ملتے ہیں۔ نہ سر پر ٹوپی ہے نہ پاؤں میں جوتا ہے، ایک بن سلی چادر پیٹھ پر پڑی ہوئی ہے، اور دوسری ٹانگوں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا لباسی سامان ان کے پاس نہیں ہے۔ آخر ان ہی کپڑوں کو وہ کیوں استعمال نہیں کرتے جن کے بغیر وہ مسجدوں میں جانا پسند نہیں کرتے تھے، اپنے بدن کو کثافتوں سے پاک کیوں نہیں کرتے، ناخن کیوں نہیں ترشواتے، بال کیوں نہیں سنوارتے، خوشبو کیوں نہیں لگاتے، بربریت اور وحشت کی بچی کھچی یادگاروں کو مٹا کر اسلام ہی نے تو مسلمانوں کو تہذیب وشائستگی کی راہوں پر ڈالا تھا۔ پھر آگے بڑھانے کے بعد اسی اسلام نے ان کو پیچھے کیوں ڈھکیل دیا، اور ڈھکیل دینا کیا معنی؟ اس نے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک جوہری عنصر حج ہی کو قرار دیا ہے۔

بلا شبہ یہ ایک سوال ہے اور بڑا اہم سوال، مگر ''الکعبۃ'' کیا ہے، ارضی کائنات کے ساتھ اس کا جو بنیادی رشتہ ہے جن کے لئے یہ راز باقی نہیں رہا ہے، کیا نماز اور حج کے اعمال وافعال، آداب وفرائض کے ظاہری تناقض وتعارض کی یہ بوالعجبی ان کے لئے بھی بوالعجبی باقی رہتی ہے؟

بلا شبہ فطرت انسانی قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا

چاہتی ہے، اس میں یہ جبلّی جستجو پائی جاتی ہے کہ قدرتی قوانین کی پابندیوں سے ساری کائنات، شجر حجر، پرندے درندے وغیرہ اپنے نوعی کمالات تک پہونچنے میں جیسے کامیاب ہو رہے ہیں اسی طرح اس کی کامیابیوں کا راز بھی ان ہی پابندیوں میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ جو دیکھا جا رہا ہے کہ عموماً بنی آدم مذہب کے نام سے احکام وقوانین کے کسی مجموعے کی پابندی کو اپنے لئے ناگزیر قرار دیے ہوئے ہیں، درحقیقت اسی اندرونی سوال کا یہ جواب ہے، یہ الگ بات ہے کہ پیدا کرنے والے کی طرف احکام وقوانین کے جس مجموعے کو منسوب کیا جاتا ہے، واقعی وہ خالق کائنات کی مرضی کی صحیح نمایندگی کرتا ہے یا نہیں، لیکن ہر پیدا ہونے والا آدمی باور یہی کرتا ہے کہ مذہب کے نام سے وہ اپنے خالق کی مرضی ہی کے پانے میں کامیاب ہوا ہے۔ بہرحال یہ ایک مستقل علاحدہ بحث ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذاہب وادیانات کے متعلق جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدائی احکام وقوانین کی پابندی کا ان میں مطالبہ کیا گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ اسلام کو بھی اسی مطالبے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کے مطابق اس کے نافذ کردہ احکام وقوانین کی تعمیل وامتثال میں زندگی بسر کرنا بندوں کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے، نشو ونما کی جو قدرتی صلاحیتیں فطرتِ انسانی میں پائی جاتی ہیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کو بارآور کرانے کی قدرتی راہ یہی ہے کہ خالق کردگار کو اپنا حاکم تسلیم کر کے بندہ اسی کا محکوم بن جائے۔ بندگی اور عبدیت اسی فرض کو طبعاً ہم پر عائد کرتی ہے، اس فرض سے عہدہ برآ ہونا اور عہدہ برآ ہونے کی کوشش یہی ہمارے وجود کا حاصل اور آخری غایت ہے۔

سچ پوچھیے تو بار بار ہر چوبیس گھنٹے میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ”حی علی الصلوۃ“ کی پکار، لاہوتی ادب گاہوں، اور ان کے بلند میناروں سے فضا میں جو گونجتی رہتی ہے، درحقیقت محکومیت اور بندگی، غلامی اور عبدیت کے اسی فرض کو یاد دلانے اور اس کے احساس کو قلب میں مسلسل جگائے رکھنے کی یہ عملی تدبیر ہے، آپ دیکھیے ان کو جنھوں نے اس لاہوتی پکار سے بہرے بنے رہنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ جب پکارنے

والے کی پکار پر چل پڑنے کے لئے وہ آمادہ ہوتے ہیں، وہ اپنی وردی درست کرتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں کہ صفائی اور پاکیزگی کے برخلاف ان کے لباس کے کسی حصے میں گندگی اور نجاست کا کوئی داغ اور دھبہ تو نہیں ہے، سکینت ووقار کی تصویر بن کر انتہائی اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پہلے اس مقام میں آتے ہیں جہاں کپڑوں سے آگے بڑھ کر اپنے جسد اور بدن کی کثافتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ کم از کم تین تین بار بدن کے ان حصوں کو دھوتے ہیں جن کی آلودگی کا عام حالات میں اندیشہ کیا جاسکتا ہے، شست وشو کے اس شغل سے فارغ ہونے کے بعد دیکھئے وہ اپنے پیدا کرنے والے خالق وحاکم کے سامنے کھڑے ہیں، تجزیہ کیجئے ان اعمال اور مشاغل کا جن میں اب وہ منہمک اور مستغرق ہوجاتے ہیں، دست بستہ قیام، قیام کے اسی حال کے بعد سر کو جھکا دینا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنا ماتھا ٹیک دینا، یہ اور اسی کے ساتھ دوسرے قولی وفعلی اجزاء وعناصر جن کی ترکیب سے مسلمانوں کی ''نماز'' کا قوام تیار ہوتا ہے، ان سب میں بتایئے کہ احکم الحاکمین، آقائے علی الاطلاق کے حاکمانہ شئون اور اقتداری تجلیوں کے سوا کیا کوئی اور چیز بھی جھانک رہی ہے؟ عقیدت ونیاز یا احساسِ محکومیت وبندگی کو تصویری پیکر میں لانے کی جو آخری شکل ہوسکتی ہے، کیا "الصلوٰۃ" یا نماز اس کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ فقر ومسکنت، احتیاج وتذلل کے جذبات کے اظہار کا زندہ قالب یہی ہوسکتا تھا، میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں اور بھی کچھ سوچا جاسکتا ہے!!!

"الصلوٰۃ" اسلام کے چار اہم ستونوں میں ایک بڑا استون ہے، اسی طرح "الزکوٰۃ" کے نام سے جس محصول کو امراء اور تونگروں سے وصول کر کے غرباء اور نامستطیع باشندوں میں اسلام تقسیم کراتا ہے، تو کیا یہ وہی فرض نہیں ہے جسے ہر حکومت اپنے باشندوں پر عائد کر کے اپنے حاکمانہ اقتدار کو ظاہر کرتی ہے۔ اور ''الصلوٰۃ والزکوٰۃ" تو دینی اسلامی رکن ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے سوا بھی اسلامی مطالبات کے بڑے، بہت بڑے ذخیرے کی بنیاد مطالبہ کرنے والے کے حاکمانہ اقتدار ہی پر قائم

ہے، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

مگر سوال یہی ہے کہ ہستی کی اس ''تجلی گاہ'' کے آخری سرچشمے کے متعلق جن جستجوؤں کو انسانی فطرت اپنے اندر پاتی ہے، کیا حاکم ومحکوم کے ان تعلقات اور ان تعلقات کے اقتضاؤں کی تکمیل کے بعد ہمارے اندر کی ڈھونڈھ کا یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، ہماری پیاس کیا بجھ جاتی ہے، آخر:

سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں! — عشوہ و غمزہ وادا کیا ہے

بحرِ وجود کے ان تموجات، اور لہروں کی توجیہ میں کیا کہا جائے؟ کیا پایا تھا ایران کے کج کلاہ اور خراسان کے آہن گر سیاہ نے گوشت وپوست، چربی اور استخوان کے اس مجموعے میں جس کا نام شیریں تھا کہ آہن گر نے تو سر پھوڑ لیا، اور خسر وخودسرا اپنے ہوش وحواس، عقل وخرد، شوکت وابہت کے سرمائے کو کھو بیٹھا۔

اس خلش اور تپش، قلق اور بے چینی، اضطراب والتہاب کے اسباب کا سراغ کیسے لگایا جائے اور کہاں لگایا جائے جو عامری دیوانے کو بن بن میں پھراتے تھے اور بیابانوں کے پتھروں کی ٹھوکروں کے ساتھ اس کو راضی کئے ہوئے تھے، وادیٔ نجد کی ہرنیوں کی لمبی گردنوں اور بڑی بڑی آنکھوں میں وہ کسے ڈھونڈھ رہا تھا، وہ کتوں کے منہ کو اس لئے کیوں چومتا تھا کہ اس کی لہریں اس چوکھٹ تک پہونچ جائیں گی جس کا بوسہ اس کی زندگی کا آخری مقصود تھا۔

بہرحال آپ اس کا نام حسن رکھیے یا جمال، یا جو جی میں آئے جس لفظ سے بھی اس کی تعبیر کیجیے، لیکن وجود کے اس تلاطم میں ایسی لہریں بھی یقیناً گھلی ملی، رچی بسی ہیں، جن کے غیر معمولی دباؤ کا فطرت انسانی انکار نہیں کرسکتی، دباؤ اور عجیب وغریب دباؤ، جس کے نیچے بسا اوقات حکومت اور سلطنت کا اقتدار بھی کھوکھلا بن کر رہ گیا ہے، مطلق العنان جباروں کو بھی اس کی گرفت کے اندر تڑپتے اور پھڑکتے دیکھا گیا ہے۔

انسانی قالب اور بشری پیکر میں حسن و جمال کے ظہور کے بعد جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے متعلق تو ایک حد تک، ''جنسی میلانات'' کے شعوری یا غیر شعوری اشاروں کو بھی دخیل ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن بہتی ہوئی نہروں، لہلاتے ہوئے مرغزاروں، چہچہاتی ہوئی چڑیوں، کھلے ہوئے شگفتہ ونیم شگفتہ پھولوں، وادیوں کے نشیب و فراز، دامنِ کوہ کی ابھرتی ہوئی بلندیوں اور ڈھلتی ہوئی پستیوں، الغرض انسانی پیکروں سے ہٹ کر جمادی، نباتی وحیوانی سانچوں میں حسن و جمال کی تجلیاں ڈھل ڈھلا کر جب سامنے آتی ہیں تو اس وقت گدھوں اور بکروں کو نہیں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو نہیں، بلکہ صرف آدم کے بچوں اور حوا کی بچیوں ہی کو بہجت ونشاط، سرور و وجد کے گردابوں میں چکر کھاتے ہوئے کیوں پایا جاتا ہے؟

پس واقعہ یہ ہے کہ جمال پرستی کہیے یا حسن پسندی، یہ انسانی سرشت کا ایسا جوہری عنصر ہے کہ اسی پر اس کے نوعی امتیاز کی بنیاد قائم ہے۔ وہ حسن کی جستجو، اور جمالی تجلیوں کی تلاش کے جذبے کے ساتھ پیدا بھی ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اسی جذبے کو ساتھ لئے ہوئے مرتا ہے۔(۱)

ان تمہیدی مقدمات کے بعد اب سوچیے کہ ناقص انسانوں کے ناقص عقول کا

(۱) بہشتی حقائق اور "الجنة" کی جن پیداواروں کی خبر قرآن میں دی گئی ہے، یورپ کے ''رہبان زادوں'' کا مادہ پرست طبقہ اس پر معترض ہے کہ انسانی نہیں بلکہ حیوانی مطالبوں کی تسکین کا سرمایہ تو یہ چیزیں بن سکتی ہیں، لیکن انسانی فطرت کے لئے یہ کچھ نہیں ہے، اسی لئے ان میں سے بعضوں نے قرآنی "الجنة" کا نام ''حیوانی جنت'' بھی رکھ دیا ہے، لیکن ان رہبان زادے مادہ پرستوں سے کون پوچھے کہ انسانی فطرت کے آگے قرآن نے جنت کی جن تجلیوں کے پیش ہونے کی خبر دی ہے، بقول حضرت شیخ اکبر کیا جانوروں، بھیڑوں اور بکریوں، چوپاؤں، گدھوں اور بیلوں کو بھی ان سے متأثر اور لذت اندوز ہوتے اس دنیا میں کبھی دیکھا گیا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ باشندگانِ مغرب کی موجودہ نسلیں جن اگلی نسلوں سے پیدا ہوئی ہیں وہ تو دنیا کے مظاہر جمال وحسن سے بھی بے زاری کو اپنا مذہب ٹھہرائے ہوئے تھیں، پھر ''جنت'' میں ان کے وجود کو وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ اور ان ہی رہبانوں سے جو نئی نسلیں نکلی ہیں ان کی مادی ذہنیت کی کثافتوں نے حسن و جمال کے ان کثیف وغلیظ مظاہر کے ساتھ ان کو قانع بنا دیا ہے جن کی ہر بھلائی میں برائی گندھی ہوئی ہے اور اس کے کسی خیر کو شر کی آلودگیوں سے قطعی طور پر پاک کرنا ناممکن ہے۔
مادی مذاق کی یہی فطری غلاظت ہے جس نے حسن و جمال کے ان لطیف وجمیل پیکروں کے تصور کی بھی گنجایش ان میں باقی نہیں چھوڑی ہے، جو زندگی کے اس دور میں سامنے آئیں گے جب خیر کو شر سے قطعی طور پر جدا کر دیا جائے گا، ''خیر مطلق'' ہی کا نام ''جنت'' ہے، اور ''شر مطلق'' ہی کی قرآنی تعبیر ''جہنم'' ہے۔

گڑھا اور تراشا ہوا دستور و آئین نہیں، بلکہ عالم الغیب والشہادہ خدائے کامل کا بخشا ہوا دین کیسے کامل ہو سکتا تھا، جب تک فطرت انسانی کی جستجوئے جمال اور تلاشِ حسن کے جذبے کی تسکین کا سامان بھی اس میں نہ کیا جاتا۔ مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب وادیان سے اس وقت بحث نہیں، لیکن اپنے اسلامی اسلاف سے جو دین ہم تک پہونچا ہے اور جن لوگوں نے ہم تک اس کو پہونچایا ہے ان کا بیان ہے، محدث الدیار الہندیہ، استاذ الکل فی الکل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فارسی زبان کی اپنی تفسیر میں حضرت ابراہیم خلیلؑ کے حج کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

''باز ایشاں را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را والہ وشیدا ساختہ دیوانہ وار وعاشق کردار، برائے گردگشتن خانہ محبوب خود برہنہ سر و برہنہ تن، و برہنہ پا، ژولیدہ مو، پریشاں حال وگرد آلودہ از شام بہ زمینِ حجاز رسید، گاہے بر کوہ وگاہے برزمیں رو بہ سوئے خانہ کردہ استادہ شوند''۔

(پھر حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے آپ کو سرگشتہ وشیدا بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد ننگے سر، ننگے پاؤں، الجھے ہوئے بال، پریشاں حالی کے ساتھ گرد میں اٹے ہوئے سرزمین حجاز میں آپہنچیں اور وہاں پہونچ کر کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں۔)

اسی قسم کی تفصیلات کے بعد بیان کو ان فقروں پر ختم کرتے ہوئے، کہ:

''گرد خانہ تجلی آشیانۂ او طواف کنند و بار بار کنجہائے آں خانہ را بہ بوسند و بہ لیسند''

(اسی تجلی خانہ کے ارد گرد گھومیں اور اس کے گوشوں کو چومیں چاٹیں۔)

حج کا جو مقصد ہے اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

''تا معنیٔ عشق ومحبت کہ در باطن ایشاں کامن ست درلباس صورت جلوہ گر شود، ومشہور خاص وعام گردد و دریں بین''

(تا کہ عشق ومحبت کا جو جذبہ ان کے باطن میں پوشیدہ ہے، وہ ظاہری شکل

وصورت کا قالب اختیار کرے اور اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے۔)

بہر حال جستجوئے حسن یا تلاشِ جمال کا جو جذبہ انسانی فطرت میں پایا جاتا ہے نہ اس کا انکار کیا جاسکتا ہے اور یہ مانا جاسکتا ہے کہ جمال وحسن کی جو تجلیاں برگِ گل اور نغمۂ بلبل سے چھلک رہی ہیں اور جن کی روشنی سے جمادی ونباتی، حیوانی وانسانی مظاہر سے بھری ہوئی یہ کائنات جگمگا رہی ہے، ان کے وجود کے اس بحر متلاطم میں کوئی آخری سرچشمہ نہیں ہے۔ ہمارا ابتدائی لاہوتی سبق ہی الحمد للہ سے شروع ہوتا ہے۔ کمال ہو یا جمال، الغرض وجود کا ہر وہ پہلو جو مستحق مدح وستایش ہو، ہم مان ہی نہیں سکتے کہ وہ نہ تھا پھر ہوا ہے۔ ''ہستی نیستی سے بھی پیدا ہوسکتی ہے''؟ عقل بھی اس تجویز سے جھنجلاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ''الاسماء الحسنیٰ''، نص قطعی کے رو سے جس ذات میں منحصر ہیں ان کے مسمّیٰ کے سوا بتایا جائے کہ ''حسن'' کے سرچشمے کو اور کہاں ڈھونڈا جائے۔

اسی سلسلے میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ:

''با آواز بلند لبیک گویاں نعرہ ہا زنند وآتشِ محبتِ اندرونی را بآں نعرہا برافروزند''۔

(بلند آواز کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے نعرے لگائیں اور ان نعروں کی راہ سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکائیں۔)

آخر میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''ایں کیفیت مناسک حج برائے ایشاں مقرر شد وطواف وسعی بین الصفا والمروہ وآمد ورفت مزدلفہ وعرفات واقامت در منیٰ وذبح وقربانی وتلبیہ واحرام مشروع گشت''۔

(حج کے مناسک میں یہی کیفیت ان کے لئے مقرر ہوئی اور اسی بنیاد پر طوافِ کعبہ، مروہ وصفا کے درمیان تگ ودو (سعی) مزدلفہ کی آمد ورفت، عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح وقربانی، احرام وغیرہ اعمال کا حکم دیا گیا۔)

اور ایک یہی کیا، آپ کو اسلامی بزرگوں کی مختلف کتابوں میں یہ اور اسی قسم کی ملتی

جلتی باتیں مل سکتی ہیں، اردو میں سیدنا قاسم العلوم والخیرات بانی دار العلوم دیوبند کی کتابوں خصوصاً ''حجۃ الاسلام'' میں حج کے ایک ایک جزء کی تشریح اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے جو کی گئی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے، اور قربانی اگرچہ میرے نزدیک دینی نظام میں اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے، تاہم حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے صاحب ''**غایة الشعور**'' نے لکھا ہے:۔

''قربانی نمودن مخبرست کہ خود را براہِ دوست ایں چنیں فدیہ نمودن شائد''۔

(حج کے موقع پر قربانی کا مطلب یہ ہے کہ دوست کے لئے چاہیے قربانی کرنے والا اسی طرح اپنے آپ کو تیار کرے کہ وہ بھی قربانی کے جانور کی طرح ہر وقت اپنی جان فدا کرنے کے لئے تیار رہے۔)

بہر حال حسنِ ازل اور جمال مطلق کی جستجو وتلاش یہی ''الحج'' کی روح ہے، اگرچہ حج کے اعمال اور مناسک کے تجزیہ وتحلیل ہی سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف اس نتیجے تک پہونچے ہیں، جیسے " الصلوٰة "یعنی نماز میں جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کے حاکمانہ اقتدار اور اس کے آثار کو بندے اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، ان اسلامی ارکان کے پھل ہی ایسے ہیں جن کو دیکھ کر معمولی عقل کا آدمی بھی درختوں کو پہچان سکتا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ حج کے مطالبے کا ذکر جن الفاظ میں قرآن کے اندر پایا جاتا ہے قرآنی طرز کے اداشناسوں کے لئے ان ہی میں اشارے ہیں، خصوصاً آخری الفاظ جن پر یہ آیت ختم ہوئی، یعنی:

ومن كفر فإن الله غني عن العالمين، اور (حج کے مطالبہ کا ناشکری کے ساتھ) جس نے انکار کیا (تو اس کو معلوم ہونا چاہئے) کہ اللہ تعالیٰ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔)

عشق ومحبت کی راہ ورسم کا جو تجربہ رکھتے ہیں، اور سوز وساز سے کچھ حصہ جنہیں میسر آیا ہے ان ہی کے چوٹ کھائے قلوب اس طریقہ بیان کے اثر کو محسوس کر سکتے ہیں،

سیدالامام الحاج امداداللہ المہاجرالمکی قدس سرہ العزیز قرآن کی دھمکی، "لا یکلمھم اللہ ولا ینظر إلیھم یوم القیامۃ"، (نہ حق تعالیٰ ان سے بات کریں گے اور نہ ان کی طرف دیکھیں گے قیامت کے دن)، کا جب ذکر فرماتے، تو کہتے کہ ساری دھمکیوں میں سب سے زیادہ جانگداز، روح گسل دھمکی میرے لئے تو یہی ہے، عمیق حکیمانہ نفسیاتی نکتہ، اس کے بعد یہ ارشاد فرماتے کہ کسی چیز سے محرومی کی دھمکی اسی وقت دی جاسکتی ہے جب اس کا مطالبہ ہمارے اندر موجود ہو، مجنوں ہی کو لیلیٰ دھمکا سکتی ہے کہ میں تجھ سے نہ بولوں گی، نہ دیکھوں گی، ورنہ جو مجنوں نہیں ہے اس کے لئے لیلیٰ کی ان دھمکیوں کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، حاجی صاحبؒ کے متعلق میں نے سنا ہے کہ آب دیدہ ہوجاتے اور فرماتے کہ آدمی کی فطرت میں اگر کسی کی ہم کلامی اور نظر لطف وکرم کا مطالبہ پوشیدہ نہ ہوتا تو یقین کرو کہ اس کو یہ دھمکی کبھی نہ دی جاتی۔

اسی نفسیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اب سوچیے کہ حج کی قدر وقیمت کے نہ پہچاننے والوں، اور اس کی اہمیت کے انکار کرنے والوں کی طرف رخ کر کے بجائے اس قسم کی باتوں کے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا، یا ان کو آگ میں جھونکا جائے گا، یہ یا اسی قسم کی مادی سزاؤں کی جگہ "ومن کفر فإن اللہ غني عن العالمین"، (اور جس نے ناشکری کے ساتھ انکار کیا (اس کو معلوم ہونا چاہئے) کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے) کے چند قرآنی الفاظ کیا اس ساری داستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نہیں ہیں جو اس سلسلہ میں اب تک آپ ہم سے اور بزرگوں کے حوالے سے سن چکے، ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے شاید نہ کہہ سکے، لیکن قرآن نے ان چند ہی لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا، ان سے کہہ دیا جو سب کچھ برداشت کرسکتے ہیں، لیکن بے نیازی اور لاپروائی کی یہ دھمکی ان کو، ان کی روح اور جان کو پگھلا دینے کے لئے کافی ہے، "چشمِ لاپروا" اور "نظر تغافل" کی بھڑکائی ہوئی آگ اور بکھیرے ہوئے انگاروں میں لوٹنے کا موقع جنھیں خدانخواستہ کبھی مل چکا ہے، وہی کچھ اندازہ کرسکتے ہیں کہ "**إن اللہ غني عن العالمین**" کی دھمکی کس مہیب جگر خراش منظر کو

سامنے لاکر (العیاذ باللہ) کھڑا دیتی ہے۔

صحاح کی مشہور حدیث جس میں جتلایا گیا ہے کہ "قابو رکھنے کے باوجود حج کی سعادت سے جو محروم رہا اور اسی حال میں مرگیا، خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہوکر مرا یا نصرانی ہوکر" اس میں بھی حج کی وہی "روح" جھانک رہی ہے، جس کے بغیر یہ تو ممکن ہے کہ "حج" کا قالب تیار کرلیا جائے لیکن اس "روح" سے بے گانگی "قلب" سے اس "قالب" کو محروم ہی رکھے گی۔

"روح حج" سے بے گانگی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جماعت اور جمعہ وعیدین کی نمازوں کے ساتھ "حج" کا رشتہ جوڑتے ہوئے آج کل پھیلایا جارہا ہے کہ روزانہ اور ہفتہ واری، سالانہ کمیٹیوں کے ساتھ اسلام نے مسلمانوں کے اجتماع عام کی کمیٹی یا کانفرنس کی تشکیل کی ایک عملی صورت حج کے ذریعہ سے نکالی ہے۔ ریسمان بافوں نے تو نہ جاننے کی وجہ سے اس لال بجھکڑانہ توجیہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، پر حیرت ہے کہ آسمان والوں نے بھی جاننے کے باوجود ان ہی کے ساتھ اپنی آواز ملانی شروع کی!!!

میں یہ نہیں کہتا کہ انسانیت کا جو بے نظیر طوفان ہر سال حجاز کے ریگستانوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہے یقیناً بے نظیر ہے کیونکہ زمین کے کسی حصے میں مختلف ممالک وامصار سے بھانت بھانت کی بولیوں کے بولنے والے مرد وزن اس خاص شان کے ساتھ کہیں بھی جمع نہیں ہوتے، حج ہی کا موسم ایک واحد موسم ہے جس میں ایک ہی میدان میں آپ کو مشرق بعید چین وجاوہ، ملایا کے باشندوں کے ساتھ مغرب اقصیٰ کے گورے چٹے آدمی ملی جلی شکلوں میں ہر سال مل سکتے ہیں، ان ہی میں آپ کو ہندی وسندی، بخاری وتاتاری، مصری وطرابلسی، الغرض ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کو بھی آپ پاسکتے ہیں اور ان سب کو جمع کر کے کسی خاص نصب العین تک پہونچنے کی دعوت بھی دے سکتے ہیں، بغیر کسی اشتہار واخبار، پروپیگنڈا، شوروشغب کے بکھری ہوئی انسانیت ہر سال ایک نقطے پر جمع ہوجاتی ہے، آپ چاہیں تو معاشرتی، تمدنی، بلکہ ضرورت

ہو، سیاسی الجھنوں کے سلجھانے کا ذریعہ بھی اس اجتماع کو بتا سکتے ہیں، لیکن کام لینا، یا لے سکنا، یہ دوسری بات ہے اور جس کام کے لئے حج کی عبادت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے یہ الگ مسئلہ ہے، آپ آم کی گٹھلی جب بوتے ہیں، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درخت بن جانے کے بعد آپ اس درخت کے پتوں، اور لکڑیوں سے ایندھن کا کام بھی لے سکتے ہیں لیکن بجائے پھلوں کے ایندھن میں پتوں اور لکڑیوں سے کام لینے کو گٹھلی بونے کی غایت ٹھہرانا، آپ ہی بتائیے کہ جنون کے سوا اور کیا ہے، سیدنا المعنوی نے سچ فرمایا ہے۔

ہر کہ کار وقصد گندم بایدش
کاہ خود اندر تبع می آیدش

گیہوں کی کاشت تو دانۂ گندم کے فراہم کرنے ہی کے لئے کی جاتی ہے، اور طفیل میں اس کے پتوں اور ڈنٹھلوں کو چور کر کے بھوسا بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن بھونسہ ہی حاصل کرنے کے لئے آج تک کسی نے گیہوں کی کاشت کی ہے؟ بقول حکیم الامت تھانوی نور اللہ ضریحہ ''اسلامی عبادات'' کی فلاسفی نکالنے کا عصری طریقہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ عرق گلاب کے قرابوں کا بھی استعمال استنجا بتایا جائے، فرمایا کرتے تھے کہ اپنی مائیت اور صفتِ سیلان کی وجہ سے ازالۂ نجاست کا کام یقیناً گلاب کے اس عرق سے بھی اگر چاہا جائے تو لیا جا سکتا ہے لیکن اس کو عرق گلاب کے وجود کی غایت ٹھہرانا، عقلی گندگی اور ذہنی غباوت کے سوا اور کیا ہے؟

اور میں تو کہتا ہوں کہ دین میں ان عباداتی عناصر کے شریک کرنے کی جو واقعی غرض وغایت ہے اس کے ساتھ اپنی من مانی خود غرضیوں کے حصول کا ذریعہ ان کو بنا لینا، ممکن ہے کہ بعض حالات میں مضر نہ ہو بلکہ مفید ہی ہو، مگر مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں نے کبھی کبھی خطرناک نتائج کو بھی پیدا کر دیا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ''حج'' اور اس کے اعمال واشغال کی تجزیہ وتحلیل ہی سے نہیں، بلکہ خود قرآنی الفاظ کے اشاروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فطرتِ

انسانی میں حسن وجمال کی جستجو وتلاش کا جو جبلّی جذبہ ہے، اسی جذبہ کے صحیح استعمال کی راہ ''حج'' کے ذریعے سے کھولی گئی ہے، اسی حسن وجمال کے لازوال سرچشمے سے ربط قائم کرنے کی یہ حکیمانہ تدبیر ہے، پچھتانا ان کو پڑتا ہے جو بجائے چشمۂ آفتاب کے دیوار و در، شجر و حجر پر پڑنے والی چلتی پھرتی، دھوپ کے دھبوں سے دل لگا کر سمجھتے ہیں کہ آفتاب کا نور ان کو مل گیا، سورج کی روشنی انھوں نے پالی، امیر مرحوم کا شعر:

چھیڑتے کیوں ہو جوانی میں حسینوں کو امیر
رات ہی بھر کا یہ جوبن ہے سحر ہونے تو دو

حقیقت بن کر ان ہی کے سامنے آتا ہے جنھوں نے دین کے اس مشورے کو قبول کر کے ندائے ابراہیمی پر لبیک کہا ہو، اور حج جیسے اس راہ کے ایجابی عمل کی قدرتی شکل ہے، اسی طرح بقول حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ یعنی روزہ اسی راہ کے سلبی عمل کا نام ہے، جس میں ان چند جوہری مرغوبات ومالوفات سے معتد بہ وقفہ تک دست بردار ہونے کی مشق بہم پہونچائی جاتی ہے جس کی گرفت اور دباؤ کو نسبتاً انسانی فطرت زیادہ محسوس کرتی ہے اپنے اس سلبی ومنفی عمل میں ہر مومن کو اس کا موقع ملتا ہے کہ اپنا امتحان وہ خود لے، پتا چلائے کہ عشق ومحبت کی وادی کے ایجابی اعمال کی صلاحیت کس حد تک اس میں پیدا ہو چکی ہے وہ ولولہ وسرمستی کے اس میدان میں کہاں تک چل سکتا ہے جس میں چلنے والوں کو مخلوقات سے رشتہ توڑ کر خالق ہی کے حسن وجمال کی جستجو میں غرق کر دیا جاتا ہے! اور اس میں کوئی شبہ نہیں ''خود امتحانی'' کی بہترین شکل روزہ ہی ہے، یہی ایک ایسا عمل ہے جس میں نفس کی شعبدہ بازیوں، اور عربدہ جوئیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، جو مومن نہیں ہے، اور اپنے دین کو خالص بنانے میں جو کامیاب نہیں ہوا ہے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ روزہ اور روزہ کے اقتضاؤں کی تکمیل پر کیوں مجبور ہوگا۔ بقول شخصے:

ملحد گرسنہ خانہ خالی برخواں
عقل باور نکند کز رمضان اندیشہ

بہر حال یہ تو ایک ذیلی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ " الحج "ہی کا سمجھنا چاہئے کہ "الصوم "یعنی روزہ بھی مقدمہ ہے، گویا جیسے " الصلوٰۃ و الزکوٰۃ" خالق کے حاکمانہ اقتدار کی تسلیم واعتراف کے عملی قوالب ہیں، اسی طرح" الصوم و الحج "حسن ازل، سرچشمۂ جمال کی جستجو وتلاش کے عملی مظاہر ہیں، زکوٰۃ حقیقت صلوٰۃ کی تصدیقی شہادت ہے، اسی لیے اسی کی تعبیر "الصدقه" سے بھی کی ہے، بقول شخصے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

زرطلبی کے مطالبے کی تکمیل، وفاداری کے زبانی دعوے کی دلیل بن جاتی ہے، اسی طرح "الصوم" حج کا فذلکہ ومقدمہ ہے، بس حقیقی مطالبہ بندوں پر جو عائد کیا گیا ہے وہ "الصلوٰۃ" والحج ہی ہے، جیسا کہ تفصیلاً آپ سن چکے کہ انسانیت کے لئے "مستقر إلى حين" یعنی وقتی قیام گاہ زمین ہی کا یہ خاکدانی کرہ جب کہ بنایا گیا، اوراس کمرے پر خالق عالم کی کامل تجلی گاہ، جو بارگاہ ربانی یا بیت اللہ کے لفظ کے اطلاق کا جائز حقدار ہے، وہ ''الکعبه'' اور وادی بکہ کا وہی حصہ چونکہ ہے جس کے ساتھ الناس کا قیام وابستہ ہے اور وہی ان کے لئے ''مثابہ'' (تقسیم رحمت کا مرکزی نقطہ) ہے اور خاک کے اس تودے کی ساری چہل پہل امن وامان کا ضامن بھی چوں کہ وہی ہے، اس لئے تلاش حق کی ان دونوں راہوں کا رشتہ بھی اسی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، اور جب تک ''الکعبہ'' ان خصوصیتوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اس وقت تک مرکزیت کا یہ اعزاز واکرام اسی کے ساتھ وابستہ رہے گا، اس کی اسی اہمیتِ مطلقہ کا یہ نتیجہ تھا کہ اسی کی فتح کو قرآن نے ''الفتح'' قرار دیا کہ ہر ملک کی کشور کشائی میں پایۂ تخت ہی کی فتح کا مسئلہ اصل مسئلہ ہوتا ہے، اس کی غیر معمولی اہمیت ہی کا اقتضا تھا کہ نسل انسانی کے سب سے بڑے سردار اور " کافة للناس" کے "بشیر و نذیر" کو اس مہم کی سرانجامی کے لئے ازل ہی سے

قدرت کی نظر انتخاب چن چکی تھی، اوراپنے اسم ''تواب'' (۱) کو پیش کرتے ہوئے اسی الفتح کے بعد خالق نے فاتح علیہ السلام کو اپنی طرف بازگشت اور پلٹ جانے کا اشارہ سورہ نصر میں جو کیا تو اس کا جو مطلب معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ زمین کے پایۂ تخت کی فتح کا مسئلہ جب طے ہو گیا تو آپ کا کام پورا ہو گیا باقی ام القری کے چاروں طرف ''القری'' یا آبادیوں کا جو طویل وعریض سلسلہ پھیلا ہوا ہے، ان کا کام امت کے سپرد کر دیا گیا۔ حتى لا يبقى بيت مدر ولا وبر إلا دخله الإسلام۔

اور یہ جو صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب چھوٹے چھوٹے پاؤں والے حبشی ''الکعبہ'' کے ایک ایک پتھر کو اکھاڑ کر اس سے جدا کر دیں گے اور یوں ''الکعبہ'' کا قصہ ختم ہو جائے گا تو اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ خود ''الکعبہ'' کے در و دیوار اور زمین کے جس حصے پر وہ واقع ہے بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ یہ سارا زور وشور اور ساری ہنگامہ آرائیاں اس رشتے کے ساتھ وابستہ ہے، جو خالق تعالیٰ وتقدس کی ذات کے ساتھ اس مکان اور اس جگہ کا قائم ہے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اپنے قلمرو کے کسی خاص علاقے یا صوبے میں بادشاہ جب آتا ہے اور شاہی بارگاہ وہاں قائم کی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس شاہی بارگاہ کی اسی وقت تک اہمیت رہتی ہے جب تک فرودگاہِ شاہی ہونے کی عزت اسے حاصل ہے، لیکن کس نے نہیں دیکھا کہ اس نسبت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی، وہ سارا

(۱) تواب کا مادہ توبہ ہے، پلٹنا اور بازگشت یہی توبہ کا لفظی ترجمہ ہے سورہ النصر کو سن کر صدیق اکبر کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہے کہ رونے لگے اور دریافت پر لوگوں سے فرمایا کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر دی گئی ہے، اس صدیقی استنباط کا مخرج میں اسی لفظ تواب کو قرار دیتا ہوں، باقی سورہ نصر اور سورہ فتح دونوں میں فتح کی بشارت کے ساتھ پیغمبر کو استغفار کا حکم جو دیا گیا اور یہ کہ خدا نے اگلے پچھلے ذنوب آپ کے معاف کر دیئے تو بظاہر خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کا تعلق فطرت انسانی کے اس اقتضا سے ہے کہ مشاہدے سے پہلے اطمینان کلی کی کیفیت اس میں پیدا نہیں ہوتی، ایسے موقعوں پر غیر اختیاری وساوس وخیالات کا پیدا ہونا طبعی امر ہے، فتح کے مشاہدے کے بعد مواعید الٰہی کے متعلقہ وساوس وخیالات ہی سے استغفار کا حکم اگر دیا گیا ہو اور حق تعالیٰ کی ذات ایسی بدگمانیوں سے پاک ہے اس لئے تسبیح کا حکم ہو تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔

میدان جس میں شاہی بارگاہ کھڑی کی گئی تھی ہو کا میدان بن کے رہ جاتا ہے پھر مزدور آتے ہیں اور اسی شاہی خیمہ کو اکھاڑ پچھاڑ کر ختم کر دیتے ہیں، اب نہ اس کے اردگرد پہرہ پڑتا ہے، نہ لاؤلشکر کا ہجوم ہوتا ہے، نہ حاجت مندوں کی آمدورفت کا سلسلہ باقی رہتا ہے، کسی موقع پر میں نے ایک روایت درج کی تھی جس کا حاصل تھا کہ جب زمین کی آزادی کا ارادہ کیا گیا تو آج جہاں پر ''الکعبہ'' کی عمارت ہے عالم علوی سے ایک خیمہ آیا اور اسی مقام پر نصب کیا گیا، میرے نزدیک قرآنی آیت "إن أول بيت وضع للناس الآيه" ہی کی یہ تفسیر تھی، الکعبہ کی یہی اصل حقیقت ہے، جسے صرف خواص ہی نہیں بلکہ عامی مسلمان بھی جانتا ہے یہی وجہ تو ہے کہ بخاری کی مذکورہ بالا روایت یعنی ''الکعبہ'' کے ایک ایک پتھر کو آخر زمانہ میں جب دنیا کے ختم ہونے کا وقت آئے گا چھوٹے چھوٹے حبشی اکھاڑ پھینک دیں گے،'' تو اس روایت کو سن کر کسی میں ''الکعبہ'' کی اہانت وتحقیر کا احساس پیدا نہیں ہوگا، ہر مسلمان جانتا ہے کہ ''الکعبہ'' کے ساتھ جو لاہوتی نسبت اس وقت قائم ہے یہ حادثہ اس نسبت کے ختم ہو جانے کے بعد پیش آئے، ظاہر ہے کہ اس کے بعد ''الکعبہ'' الکعبہ ہی کب باقی رہتا ہے بلکہ چند پتھروں کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گا، اب اس کے پتھروں کا نکالنا یا کسی عام معمولی مکان کی اینٹ سے اینٹ کا بجا دینا دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا، حجرِ اسود کو خطاب کر کے روایتوں میں جو آیا ہے کہ عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ ''تیری حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ تو ایک پتھر ہے چونکہ رسول اللہ ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے میں نے دیکھا ہے اس لئے میں بھی تجھے بوسہ دیتا ہوں'' حاصل عمر فاروق کے الفاظ کا یہی ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بحمد للہ "الکعبہ" کے ہر ہر پتھر کے متعلق اسی ایمانی بصیرت سے مسلمانوں کی عام جماعت، سرفراز ہے، ان میں ہر ایک "يقلعها حجراً حجراً" (اکھاڑ دے گا کعبہ کے ایک ایک پتھر کو) والی روایت کو ہمیشہ سنتا ہے، اور اس کی پیشانی کی شکنوں میں ہلکی سے جنبش بھی نہیں ہوتی، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ خصوصیت کے ساتھ حجر اسود ہی کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے ایمانی

احساس کا جو اعلان فرمایا تو۔۔۔۔اس کی وجہ یہی ہو کہ دیوار کعبہ میں شریک ہونے کی صفت تو ان سارے پتھروں میں پائی جاتی ہے جو اس مکان کی تعمیر میں استعمال کیے گئے ہیں جن میں ایک حجر اسود بھی ہے، لیکن علاوہ اس عام وصف کے حجر اسود ہی ایک ایسا تاریخی پتھر اس مکان میں رہ گیا ہے جو کعبہ کی ابتدائی تعمیر سے اس وقت تک مسلسل چلا آ رہا ہے ممکن ہے کہ بعض دوسرے پتھروں کی نوعیت بھی یہی ہو لیکن عرب کی موروثی روایات جو نسلاً بعد نسل ان میں ''الکعبہ'' کے متعلق منتقلی ہوتی چلی آتی تھیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پرانا پتھر کعبہ کی دیواروں میں حجر اسود ہی رہ گیا ہے گویا خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ تک جن جن روحانی ہستیوں، اللہ کے دوستوں کا ''الکعبہ'' سے تعلق پیدا ہوتا رہا، جس نے ایک ایسا امتیاز حجر اسود کو بخش دیا ہے جس کا دعویٰ اسی ''الکعبہ'' کی دیواروں کے دوسرے پتھروں کے متعلق یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایسی چیز جو خدا کے برگزیدہ ترین بندوں یعنی حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کے لمس ومس کے شرف وسعادت سے قطعی طور پر سرفراز ہوئی ہو، اگر ڈھونڈھی جاوے تو عرب ہی نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ زمین کے اس پورے کرے پر ''الکعبہ'' کے اس سیاہ پتھر کے سوا صحیح تاریخ کی روشنی میں کوئی دوسری چیز ڈھونڈھنے والوں کو نہیں مل سکتی، کم از کم اتنا تو بہرحال یقینی اور قطعی ہے کہ سید الانبیاء والرسل محمد رسول اللہ ﷺ کے مبارک لبوں کے ساتھ اتصال کا شرف اس پتھر کو ضرور حاصل ہوا ہے، اور قرآنی خبروں کو جو مانتے ہیں کہ وہ خدائی خبریں ہیں ان کو بہرحال یہ تسلیم ہی کرنا چاہیے کہ معماران کعبہ ابراہیم خلیل، اور اسماعیل صدیق وذبیح کی مقدس انگلیوں نے بھی اس پتھر کو ضرور چھوا ہے۔

شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ حجر اسود ''یمین اللہ'' یعنی خدا کا داہنا ہاتھ ہے، آخر قرآن ہی میں جب ہمیں بتایا گیا ہے کہ جن کے ہاتھوں پر پیغمبر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں، ان کو سمجھنا چاہیے کہ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے ''يد الله فوق أيديهم'' جب قرآنی نظریہ ہے، تو جس پتھر کو خدا کے پیغمبروں کے ہاتھوں نے

چھوا ہے، اگر خدا کا ہاتھ اسی پتھر میں ہمیں نظر آتا ہے تو آپ ہی بتایئے کہ قرآن کی بخشی ہوئی روشنی میں ہماری ایمانی آنکھ آخر اس کے سوا اور کیا دیکھئے اسی لئے تو سمجھا جاتا ہے کہ حجر اسود کا استلام اور تقبیل یعنی اس پتھر کو طواف کرتے ہوئے چھونا اور بوسہ دینا، گویا توحید کے ان دعاۃ اور منادیوں کے ہاتھوں پر بیعت کرنا اور ان بزرگوں کے ہاتھوں کو بوسہ دینا ہے، جن کے ہاتھوں کو خدا نے اپنا ہاتھ نص صریح میں قرار دیا ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، الکعبہ ہو یا الکعبہ کی دیواریں ہوں، ان دیواروں کے پتھر ہوں، بجائے خود ان کی حیثیت کچھ نہیں ہے، مگر باوجود اس کے، نمازوں میں اسی کو مرکز بنا کر سارے جہاں کے مسلمان اسی کی طرف جو اپنا رخ پھیر دیتے ہیں، یا طواف کا فریضہ اسی کے گرد چکر لگا کر جو ادا کیا جاتا ہے، تو یہ سارا کرشمہ اس انتسابِ خصوصی کا ہے جو خالق کائنات اور اس کے نمایندوں دوستوں کے ساتھ یہ عمارت رکھتی ہے۔ ''واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی'' (یعنی ابراہیم کے قیام کی جگہ (الکعبہ سے رشتہ قائم کرکے) نماز کی جگہ بناؤ اس میں اللہ کے ایک دوست ہی کی نسبت کا تو حوالہ دیا گیا ہے، اور یہ ایک ایسی ظاہر و باہر بین حقیقت ہے جس سے مسلمان تو مسلمان، میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان نہیں ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دین کی بنیاد ہی خالق پرستی پر مبنی ہے۔

اسی لئے کسی قسم کی مخلوق ہو، مسلمانوں کی نہ وہ معبود بن سکتی ہے اور نہ مسجود، جیسے مسجد کی دیواروں کے آگے سجدہ کرنے سے کوئی نہیں سمجھتا کہ مسلمان ان دیواروں کو سجدے کرتے ہیں بلکہ ہر ایک جانتا ہے کہ دیواریں مسجود لہ نہیں بلکہ مسجود الیہ سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، بالفاظ دیگر دیوار کے لئے سجدہ نہیں کیا جاتا، بلکہ سجدہ تو خالق کائنات ہی کے لئے کیا جاتا ہے البتہ رخ نمازیوں کا مسجد کی دیواروں کی طرف ہوتا ہے، استقبال کعبہ کا لغۃً واصطلاحاً ہر لحاظ سے یہی مطلب ہے، اپنے تو اپنے غیر بھی یہی جانتے ہیں۔

مگر باوجود سب کچھ جاننے اور پہچاننے کے غالباً ستم ظریفیوں کی تاریخ میں یہ

لطیفہ اپنی نظیر آپ ہی ہوگا کہ بازاریوں کو نہیں بلکہ اچھے خاصے بھاری بھرکم سنجیدہ علمی طبقے سے تعلق رکھنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ مخلوق پرست قوموں کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے مسلمانوں پر اس تہمت کے جڑنے کی جرأت کر رہے ہیں کہ آخر "الکعبہ" کے پرستار وہ بھی ہیں اور ''الکعبہ'' چند مخلوق پتھروں کے سوا اور کیا ہے، پھر مسلمان "الکعبہ" کو جب پوجتے ہیں، تو بالواسطہ پتھروں کے پوجنے کے مرتکب کیا وہ بھی نہیں ہو رہے ہیں؟ معذرت ہی سہی لیکن اس قسم کی چھچھوری باتوں پر انصاف اور حقیقت کی آنکھوں سے اگر خون ٹپک پڑے تو جس قسم کی یہ حرکت ہے، بتایا جائے کہ اس کا نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے!!!

یہ کہنا کہ بت پرست بھی تو پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کو نہیں پوجتے بلکہ حقیقی توجہ ان کی مخفی نادیدہ قوت کی طرف ہوتی ہے جس کی نمایندگی بت کرتے ہیں، عجیب ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مخلوق پرستوں میں جن جن ناموں کے ساتھ بت پوجے جاتے ہیں، آپ ان کی فہرست بنالیجیے، آپ دیکھیں گے ان کے سارے معبود خالق نہیں بلکہ مخلوقات ہی کے کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً وہ کسی مرتے ہوئے انسان یا حیوان، یا ملائکہ، جن، بھوت، پریت وغیرہ کے نام ہوں گے، ظاہر ہے کہ ''الکعبہ'' کو جس ذات کے ساتھ انتساب کا شرف مسلمانوں کے نزدیک حاصل ہے وہ مخلوق نہیں، بلکہ خالق کائنات کی ذات ہے، پھر مخلوقات کی نمایندگی کرنے والی مورتیوں کو "الکعبہ" پر قیاس کرنا کس حیثیت سے صحیح ہو سکتا ہے اور مان بھی لیا جائے (اگرچہ قطعاً یہ ایک ایسی بات کو تسلیم کرلینا ہے جو واقعہ نہیں ہے) مگر مان لیجیے جیسا کہ اس زمانے میں بعضوں کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا ہے کہ پتھر کی کھودی جن مورتیوں کو وہ پوجتے ہیں ان کے نزدیک وہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی نمایندگی کا کام انجام دیتی ہیں، کہتے ہیں کہ نادیدہ خالق کے دھیان کو ان ہی دیدہ مورتیوں کو سامنے رکھ کر ہم جماتے ہیں، بت پرستی کی یہ تازہ توجیہ جو قطعاً ایک غیر واقعی توجیہ ہے، بہر حال جب کبھی اس توجیہ کا ذکر میرے سامنے آیا تو دل نے

ہمیشہ یہ فیصلہ کیا کہ کچھ اور ہو یا نہ ہو، لیکن مخلوق پرستی کے طرفداروں کی شکست فاش کا یہ کھلا ہوا اعتراف ہے، کیوں کہ واقعہ خواہ کچھ ہی ہو، توجیہ کرنے والوں نے تو یہ مان ہی لیا کہ مخلوق پرستی کو وہ بھی ایک غلط مسلک سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کے نزدیک بھی انسانیت کے ارتقا کا طبعی طریقہ یہی ہے کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ اور اس کے کمالات وصفات سے ربط پیدا کیا جائے۔ اختلاف جو کچھ بھی باقی رہ جاتا ہے وہ صرف خالق کے طریقۂ عبادت میں، یعنی مورتی پوجا کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک خالق پرستی کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ایک دیکھی بھالی مورتی کو سامنے رکھ کر خالق کا دھیان جمایا جائے، لیکن خالق پرستی کے اس طریقے پر اصرار کرنے والوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آخر ان مورتیوں سے خالق کے دھیان کو جو آپ جماتے ہیں، اس کی منطقی توجیہ کیا ہے؟ یعنی ان دیکھے خالق کی طرف دیکھی ہوئی مورت سے آپ کا خیال کس علاقے کی پشت پناہی میں منتقل ہوتا ہے؟ تصویر میں اور جس کی وہ تصویر ہو، دونوں میں صوری مشابہت ہونی چاہیے، گدھے کی تصویر کو سامنے رکھ کر اپنی بیوی کی تصویر کو آدمی کیا اپنے اندر تازہ کرسکتا ہے؟ سوال یہی ہوتا ہے کہ مورتیاں جن میں عموماً مردوں یا عورتوں کی ہیئت پر شکل وصورت قائم کی جاتی ہے، اب خواہ مردانی صورت ان کی ہو یا زنانی، اس کو سامنے رکھ کر اس ذاتِ بے ہمتا کا دھیان کیسے جمایا جاسکتا ہے؟ جو نہ مردوں کی جیسی صورت رکھتا ہے اور نہ عورتوں جیسی شکل اس کی ہے۔ آخر اس کا ''تزنکار'' اور برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ہونا، یہ تو فطرت انسانی کا ایک متفقہ جبلی شعور ہے۔

اور اگر یہ مطلب ہے کہ خالق کی کسی مخلوق کو سامنے رکھ کر آپ چاہتے ہیں کہ خالق کی یاد کو تازہ کریں، تو اس کے لئے کیا آسمان وزمین، شجر وحجر بلکہ کائنات کا ایک ایک ذرہ کافی نہیں ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تراشی ہوئی مورتیوں اور ڈھالے ہوئے بتوں میں انسانی صنعت کاری، اور کاریگری کے آثار ونتائج بھی چونکہ شریک ہوجاتے ہیں اس لئے

خالق کی یاد کی تجدید میں بجائے مدد ملنے کے اس کا زیادہ اندیشہ ہے کہ راہ کے وہ روڑے نہ بن جائیں، خصوصاً جب روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی اسٹیچو یا مجسمے کو دیکھ کر ذہن عموماً اس بت تراش اور مجسمہ ساز کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اپنی صنعتی مہارت اور چابکدستی کے کمالات کو پتھر یا لکڑی وغیرہ کے ٹکڑوں میں نمایاں کرتا ہے، اور اس سے بھی زیادہ گہرا یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ مورتیوں کے سامنے جاکر یہ دیکھا جاتا ہے کہ پجاریوں کی تشفی ہوجاتی ہے، بتوں کے آگے حضوری، اسی کو وہ سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، گویا پتھر کی کھودی ہوئی کسی مورتی کے سامنے چند پھول یا پھل وغیرہ کو رکھ دینے کے بعد یقین کرلیتے ہیں کہ ان کو سب کچھ مل گیا، اس کے بعد قدرتاً ''تلاش حق'' کا جو فطری جذبہ انسانی سرشت میں گندھا ہوا ہے، اس جذبے کے تقاضے اس عمل کے بعد سرد پڑجاتے ہیں، برخلاف اس کے کہ ''الکعبہ'' میں پہونچنے کے بعد بھی جب کسی ''معین شکل'' میں مومن کا خدا سامنے نہیں آتا تو بجائے کم ہونے کے یہ واقعہ ہے، روزمرہ کا تجربہ ہے کہ محبوب ازلی کی جستجو کا شعلہ سینے میں زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتا ہے، ان ہی کھدی اور ڈھلی ہوئی مورتیوں یعنی ''الاصنام'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسا کہ قرآن میں نقل کیا گیا ہے، امام الموحدین سیدنا ابراہیم خلیل علیہ وعلیٰ نبینا الصلاۃ والتسلیم خدا کے سامنے ان الفاظ کے ساتھ جو گڑگڑائے تھے کہ:

"رب انهن أضللن كثيرا من الناس"، (اے پروردگار ان بتوں نے بہتوں کی راہ ماری۔) اس دعائیہ فقرہ کا ایک بڑا تفسیری پہلو یہی نفسیاتی مسئلہ ہوسکتا ہے۔

هذا ماعندی، والله أعلم بالصواب، ونعوذبالله من شرور أنفسنا والله يقول الحق وهو يهدى السبيل.

☆☆☆☆☆☆☆☆